ناول "اور مزاج دار لٹ گئی"

مولوی نذیر احمد کی حالات زندگی اور ادبی خدمات:

آپ کا نام نذیر احمد اور خطاب شمس العلماء ۶ دسمبر ۱۸۳۳ء کو بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سعادت علی تھا۔ آپ کے والد آپ کو عالم دین اور عالم و فاضل بنانا چاہتے تھے۔ اور نو برس کی عمر میں ہی دہلی لا کر مولوی عبدالخالق امام شاہی مسجد کے حوالے کیا۔ لیکن آپ مولوی بننے کے بجائے اردو کے پہلے ناول نگار بنے۔ ۱۸۴۵ء میں دلی کالج میں داخلہ لیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے دوران قانون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا موقعہ ملا۔ حکومت نے محکمۂ تعلیم سے نکال کر تحصیل دار اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر بنایا۔ حکومت کی طرف سے سے اچھی کتابیں اور مضامین لکھنے پر کئی انعامات حاصل کئے۔ ۱۸۶۷ء میں اردو کا پہلا ناول نکال کر اردو ناول نگاری کی بنیاد رکھی اور حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اردو ادب میں مولوی نذیر احمد دو چیزوں سے مشہور ہے۔ اول تو وہ اردو زبان کے پہلے ناول نگار تھے۔ دوم انہوں نے علمی اور مذہبی معلومات پر قلم اٹھایا۔ آپ کا طرز تحریر سب سے نرالا، صاف اور زوردار ہے۔ آپ ۱۹۱۲ء میں انتقال کر گئے۔

نثری صنف "ناول" کی تعریف

ناول انگریزی لفظ ہے۔ اس کے معنی ''نئے'' کے ہیں۔ انگریزی میں کہانی کی اس قسم کو یہ نام اسلئے دیا گیا ہے کیونکہ اس کا انداز داستان یا قصہ کے مقابلہ مین نیا تھا۔ ناول وہ نثری تحریر ہے جس میں ایسی کہانی بیاں کی گئی ہو جو زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ ناول کا فن دراصل معاشرتی یا انفرادی زندگی کی ترجمانی اور تصویر کشی کا فن ہے۔ ناول زندگی کے مسائل پہ بحث کرتا ہے۔ اس کے کردار انسان ہی ہوتے ہیں۔ ایک اچھے ناول میں زندگی کا نقشہ لازمی شے ہے۔

ناول نویس اپنے فکر و خیال سے ایک نئی حقیقت کو خلق کرتا ہے۔ جو دراصل زندگی کے حقائق سے ماخوذ ہوتی ہے۔ ناول کے اجزائے ترکیبی میں کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمہ اور نظریۂ حیات پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے۔ ناول ایک خیال ہے جو لوگوں تک پیغام لیجانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ناول کی بہت سی قسمیں ہیں جیسے روحانی، جاسوسی، سماجی، اقتصادی وغیرہ۔ پرانی ناولوں کا مقصد صرف معاشرت کو ٹھیک کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ ناول ہر کسی موضوع پر لکھی جانے لگی۔

عزیز احمد، خدیجہ مستور، قراۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، قاضی عبدالستار اور انتظار حسین کے ناول جدید عہد کی نمایندگی کرتے ہیں۔

ناول اور مزاج دار لٹ گئی'' کے کتابی سوالات کے جوابات

جواب(۱)

جمن بے وقوف عورتوں کو پھسلانے کے واسطے طرح طرح کے تبرکات اور صدہا قسم کی چیزیں اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔ ان اشیاء میں چند درج ذیل ہیں

الف) تسبیح	ط) کوہ طور کا سرمہ	ف) نادِ علی
ب) خاک شفا	ظ) خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا	و) پنجسورے
ج) زمزمیا	ع) عقیق البحر	ہ) مختلف اقسام کی دوائیاں
د) مدینہ منورہ کی کھجوریں	غ) مونگے کے دانے	

جواب۲:

جمن مکارہ نے مزاج دار سے قیمت لئے بغیر فیروزے کی انگوٹھی اس کی ندر کر دی کیونکہ وہ اسے ٹھگنے کی خاطر اور اس کے گھر کے سارے اسرار و رموز جاننے کیلئے اس کے دل میں جگہ بنانا چاہتی تھی اور وہ ان مقاصد ناپاک میں کامیاب بھی ہوتی ہے۔

جواب۳)

مزاج دار بہو کو بے وقوف بنانے کی خاطر جن نے نمائشی اشیاء دکھا کر اپنے تعین مرغوب کیا۔ چند اشیاء قیمت خفیف (کم قیمت) لیکر فروخت کیں اور چند اشیاء بن داموں اس کی نذر کیں۔ مثلاً سرمہ اور نادعلیؓ قیمت قلیل لیکر فروخت کیں اور فیروزے کی انگھوٹھی بلاقسمت اس کی نذر کردی۔ جن ٹھگنی نے مزاج دار کو پھسلانے کی خاطر عجیب وحیرت انگیز قصے بھی سنائے

جواب۴)

باوجود عقلمند ہونے کے محمد عاقل جن ٹھگنی کی چال کو اسلئے نہ سمجھ سکا کیونکہ اس کے دل و دماغ پر حرص وحوس کا پردہ پڑ گیا۔ طمع نے محمد وعاقل کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دیا کہ اتنی موٹی بات وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ روپے کا مال چار آنے کو کوئی بے وجہ بھی دیتا ہے۔

جواب۵)

ایک روز جن ٹھگنی نے مزاج دار کے چند سونے کے زیورات صاف کروانے اور چمکیلا بنوانے اور چند زیورات میں دھاگا پروانے کا بہانہ کر کے سمیٹ لئے اور زلفن کو اپنے ہم راہ لیا۔ کچھ فاصلے کے بعد گلی کے نکڑ پر زیورات علیٰحدہ کرنے کی غرض سے رومال کھول دی اور ناک کی کیل گھر پر بھول جانے کا بہانہ کر کے زلفن کو کیل فراہم کرنے کی خاطر گھر روانہ کیا۔ اس طرح جن مزاج دار کے زیورات لوٹ لینے میں کامیاب ہوگئی۔

مقالہ "اقبال اور انسانیت"

مقالہ یا مضمون نگاری کی تعریف:

مقالہ جدید نثری صنف ہے اور عالمی ادب میں اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ مقالہ عربی لفظ ہے جس کے معنی قول اور مقولہ ہیں۔ مقالہ میں کسی موضوع یا شخصیت کے بارے میں تحقیق کے بعد بحث کی جاتی ہے۔ چھان بین اور تحقیق کے بعد ہی مقالے لکھے جاتے ہیں مقالہ ایسی تحریر

کو کہتے ہیں جس میں کوئی واقعہ پیس کیا گیا ہو۔ مقالہ میں کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کا انداز بہت سنجیدہ ہوتا ہے۔ مقالہ میں میٹھی اور شگفتہ زبان کا استعمال ہوتا ہے۔

عالمانہ افکار کے مدلل اظہار کے لئے مقالہ وجود میں آیا ہے۔ اردو زبان میں اس صنف کا آغاز بدستِ سرسید احمد خان ہوا۔ سرسید احمد خان نے متعدد سماجی مسائل اور موضوعات پر اپنے خیالات ربط و تسلسل کے ساتھ عالمانہ زبان میں پیس کئے۔ علامہ اقبالؔ، مولانا حالی، ظفر علی خان، شبلی نعمانی، مولانا آزاد وغیرہ اردو زبان کے چند مقالہ نگار ہیں

مقالہ کائنات کی ہر شے پر لکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر انسانی زندگی اور ان کی اخلاقی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی زندگی کو سمجھنے کیلئے مقالہ لکھے جاتے ہیں۔

مقالہ کی اپنی تاریخ ہوتی ہے جو واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مقالہ ماضی، حال اور مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ مقالہ میں عام طور پر اوصاف حمیدہ اور زندگی سے رابطہ ضابطہ رکھنے والے پہلو اور انسانی قدریں اجاگر کی جاتی ہیں۔

مقالہ اقبال اور انسانیت کے چند درج شدہ اسعار کی تشریحات

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

اقبالؔ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو سچے مومن ہوتے ہیں وہ دنیا میں نئی نئی بستیاں آباد کریں گے۔ وہ ساری دنیا کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میری نظر صرف کوفہ اور بغداد کی طرف نہیں ہے بلکہ میں ساری دنیا کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں

فقیہہ شہر کی تحقیر کیا مجاد مری مگر یہ بات کہ میں چاہتا ہوں دل کی کشاد

اقبال کہتے ہیں کہ میں شہر کے مولوئیوں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا ہوں اتنی میری مجال کہاں۔ بلکہ میں ان کے دلوں کو وسعت چاہتا ہوں کیونکہ وہ تنگ نظر ہوتے ہیں۔ میں ان کی بے عزتی نہیں کرتا ہوں بلکہ ان کو یہ احساس دینا چاہتا ہوں کہ ان کا مقصد کیا ہونا چاہئے اور وہ کیا کرتے ہیں۔

نہ فلسفی سے ملّا سے ہے غرض مجھ کو یہ دل کی موت، وہ اندیشہ ونظر کا فساد

اقبالؔ کہتے ہیں کہ مجھے فلسفی اور ملّا سے کوئی غرض نہیں ہے کیونکہ فلسفی دل کا مردہ اور ملا فتنہ فساد اٹھانے والا ہوتا ہے۔ اسے ہمیشہ فتنہ اور فساد کی فکر ہوتی ہے۔

کئے ہیں فاش رموز قلندری میں نے کہ فکر مدرسہ و خانقاہ سے ہو آزاد

اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں نے قلندری کے تمام پوشیدہ راز ظاہر کئے ہیں۔ اس لئے کہ میں ان تمام جگہوں یعنی مدرسہ اور خانقاہوں کو ان پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ غالب وکار آفرین، کارکشاد، کارساز

اقبالؔ کہتے ہیں کہ بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہر ایک کی مدد کرنے والا، مشکلات حل کرنے والا اور تعریف کے قابل ہوتا ہے۔

خاکی و نوری نہاد، بندہ مومن کا ہاتھ ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ایک سچے مومن کو دنیا کی کوئی خبر نہیں ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی آرزوؤں اور تمناؤں سے الگ ہوتا ہے یعنی دور ہوتا ہے۔ اس میں خالق کے صفات موجود ہوتے ہیں۔ اس کا دل دونوں جہانوں سے زیادہ دولتمند اور بے نیاز ہوتا ہے اور وہ بے شمار کمالات لا، ا؛ل پوتا ہے۔

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دل فریب، اسکی نگاہ دلنواز

بندۂ مومن کے دل میں بہت کم آرزوئیں ہوتی ہیں۔ وہ دنیا کی تمنّاؤں سے الگ ہوتا ہے۔لیکن اس کے مقاصد بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔اس کی ہر ایک ادا دل کو خوش کرتی ہے۔ اس کی نظریں دلکش ہوتی ہیں۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب ایک مومن کسی سے بات کرتا ہے وہ بہت ہی نرم انداز اختیار کرتا ہے۔ چاہے وہ اس وقت لڑائی کے میدان میں ہو یا کسی محفل میں۔ ہر جگہ وہ صاف و پاک ہوتا ہے۔اسکے ارادے ہر جگہ اور ہر وقت بلند ہوتے ہیں۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　بے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

اقبالؔ کہتے ہیں کہ نہ تو میں مسجد کا بے وقوف ملاّ ہوں اور نہ ہی نئی تہذیب کا بیٹا ہوں۔ میں آج کے دور کا فیشن پرست آدمی نہیں ہوں۔ میں وہ ہی بات کہتا ہوں جسے میں حق مانتا ہوں میں جھوٹ کا عادی نہیں ہوں۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بے گانے بھی ناخوش　　میں زہر ہلال کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اقبالؔ کہتے ہیں کہ مجھ سے اپنے بھی پرائے بھی ناراض ہیں کیونکہ میں ہمیشہ وہ ہی بات کہتا ہوں جو حق ہے۔ میں جھوٹ کا دادی نہیں ہوں۔ میں نے کبھی بھی زہر کو میٹھی چیز نہیں کہا ہے بلکہ زہر کو ہر وقت زہر ہی بتایا ہے اسی لئے میں اپنوں اور غیروں کا دشمن بن گیا ہوں کیونکہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔

پر سوز و نظر بازو و نکو بین و کم آزاد آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند

اقبالؔ کہتے ہیں کہ بندۂ مومن ہمیشہ پُرسوز رہتا ہے۔ وہ اپنی نظر میں وسعت رکھتا ہے۔ ہر وقت اس کی نظر میں پاک ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو تنگ نہیں کرتا ہے۔ وہ دنیا کی تمناؤں سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں یعنی وہ لالچ کے بغیر ہوتا ہے۔ اسکے باوجود وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے۔

ہر حال میرا دل بے قید ہے خرم کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

اقبال کہتے ہیں کہ میرا دل ہر حال میں خوش اور آزاد ہے۔ جس طرح کوئی بھی چیز ایک غنچے سے مسکرانے کی ادا نہیں چھین سکتا ہے اسی طرح میری اازادی اور خوشی مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ دنیا کی کوئی بھی خرابی مجھ پر اثر نہیں کر سکتی ہے۔

شکتی بھی شانتی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی بکتی پربت میں ہے

اقبالؔ کہتے ہیں کہ دنیا میں امن اور آزادی صرف قومی گیتوں میں ہے جو انسانیت کا سبق دیتے ہیں۔ زمین پر رہنے والوں اور بسنے والوں کی آزادی صرف اس بات میں ہے کہ وہ آپسمیں ملجل کر اور پیار و محبت سے رہے۔ کیونکہ پیار و محبت سے رہنے میں ہی نجات حاصل ہوسکتی ہے۔

مقالہ "اقبالؔ اور انسانیت" کے کتابی سوالات کے جوابات

جواب (۱)

اقبال کے مطابق اپنی خودی کے احترام کے ساتھ ساتھ دوسروں کی خودی کے سچے احترام سے ہی صالح زندگی کی تعمیر ہوسکتی ہے۔ صالح زندگی کا راز اپنی خودی اور دوسروں کی خودی کے احترام میں ہی پوشیدہ ہے۔ جب یہ دونوں چیزیں کسی فرد میں جمع ہو جائیں تو اس میں

خوداری، صداقت، دیانت داری اور جرأت کی صفات پیدا ہوتی ہیں اور جماعت کے رکن کی حیثیت سے ہمدردی، رواداری اور فراخ دلی سے کام لینا سیکھتا ہے۔

جواب۲:

بموجب اقبالؔ خودی سے مراد انانیت، غرور و تکبر یا نمود و نمائش نہیں بلکہ کود شناسی اور معرفت نفس ہے یعنی اپنے نفس کو پہچاننا ہے۔ ایک انسان جب اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے کہ وہ کیا ہے، اس دنیا میں اس کی آمد کا مقصد کیا ہے تو وہ خود بخود خالق شناس بن جاتا ہے۔ اسے ہر ذرہ میں خدا کے جلوے نظر آتے ہیں۔ بقول شبیبؔ رضوی

اس نے کتنی لطیف بات کہی
خود ناسی خدا شناسی ہے

خودی سے ایک انسان میں اوصاف حمیدہ مثلاً صداقت، دیانت داری، جرأت، رواداری، خاکساری وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

جواب ۳)

بمطابق اقبالؔ دنیا کی ہر ایک قوم نفاق کا شکار ہوگئی ہے۔ اقوام دنیا ایک دوسرے کے تعین اپنے دلوں میں تعصب کو جا دیتے ہے۔ گو بسبب نفرتیں عام ہوگئی۔ قوم، نسل، رنگ، ذات پات اور ملک کے تصور نے اہل دنیا کے درمیان مخالفت کی دیواریں کھڑی کر کے زندگی کے حسین نقشے کو بگاڑ دیا ہے۔ اقوام مہلک تھیاروں کی ایجادات میں محو ہیں اور دنیا کو تباہ برباد کرنے پر تلے ہیں۔

جواب(۴)

اقبالؔ کی شاعری کے بنیادی فکری پہلوؤں میں جن کی وضاحت خواجہ غلام السیدین نے مقالہ ''اقبال اور انسانیت'' میں کی ہے، بنی نوع انسان کی وحدت، ہمدردی، احترام خودی،

رواداری اورانسان دوستی قابلِ ذکر ہیں۔اقبال کا پیغام مخالفت اوردشمنی کی دیواریں کھڑا کرنے والوں کے خلاف ایک جہاد ہے۔آپ کی نظمیں حقائق، فلسفہ اور جوش عمل کی علمبردار ہیں اور جذبات نگاری کا سرچشمہ ہیں۔آپ نے نوجوانوں کو پیغام دیا کہ جاگو، اٹھو، اپنی قوت کو پہچانو اور دنیا میں اپنی قوت کو ثابت کرو، آپ نے ہرانسان کو بندۂ مومن بننے کا پیغام دیا ہے۔یہی روح ہے آپ کے فلسفہ کی۔

جواب(۵)

انسان اورانسانیت کی فلاح کے لئے تمام بتان بے فیض مثلاً قوم، رنگ ونسل، ذات پات اور ملک کے تصور، جن کی وجہ سے مخالفت اور دشمنی کی دیواریں کھڑی ہوگئی اور زندگی کا حسین نقشہ بگڑ گیا ہے، کے خلاف جہاد کرنا لازمی ہے۔

اقبالؔ نے انسانیت کی فلاح کے لئے جذبۂ اخوت، رواداری، شرافت فراخ دلی اور انسان دوستی لازمی اوصاف قرار دئے ہیں۔

جواب(۶)

مقالہ ''اقبال اورانسانیت'' میں خواجہ غلام السّیدین نے اقبالؔ کے تصورانسانیت مومن کی پہچان کا تذکرہ کیا ہے۔ذات پات، رنگ ونسل نے انسان اورانسانیت کے خوبصورت نقشے کوخراب کررکھا ہے۔اقبالؔ کا کلام اس خرابی کے خلاف ایک جہاد ہے۔اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں اسلام کی وکالت نہیں کرتا بلکہ انسانی سماج کوٹھیک اور بہتر دیکھنا چاہتا ہوں۔یہ تب ہی ممکن ہے جب تمام تفرقے دلوں سے ختم کردئے جائیں۔

اقبال نے عشق حقیقی کوعقل پرترجیح دی ہے اورعلم کولازمی قرار دیا ہے۔ایک انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی خودی کا احترام کرے۔اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ہمیں اپنی خودی پیاری ہوتیہے اسی طرح دوسروں کی خودی کا بھی احترام کرنا چاہئے۔اس سے انسان مین صداقت،

دیانت داری اور جرأت کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ ایک انسان کو چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کا خون پینے کے بجاء ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا ساتھی بنے۔ سائینس اور علم کی ایجادات نے ایک انسان کو بے اندازہ طاقت بخشی ہے۔ یہ ایجادات انسانیت، خوشحالی اور زندگی بہتری کے لئے استعمال کی جاسکے۔ یہ ان کا مرکزی خیال اقبال کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ انسان بندۂ مومن بنے۔ ان کا یہ پیغام کوئی نیا پیغام نہیں ہے بلکہ ہر ایک فلسفی، ولی اور خدا کے نیک بندے یہ بات کہی ہے۔ اس لئے کوئی بھی شخصیت اقبالؔ کو ایک اچھا پیغمبر کہتا ہے۔ کیونکہ ایسے دانا انسان بار بار پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے انسان ملک اور قوم کی ہی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ ساری دنیا اور ہر آنے والے زمانے کی ملکیت ہوتے ہیں۔

جواب(۷)

لفظ: خیال

جملہ: محسر کی پرسش کے خیال سے میری روح کانپ اٹھتی ہے۔

لفظ: تلاش کرنا

جملہ: وہ اس قدر بے وفا ہو گئے کہ اس کو تلاش کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

لفظ: ٹھیس

جملہ: عبدالرحمان کی علیٰحدہ پسندی سے اس کے والد کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے۔

لفظ: حامی

جملہ: حمید کا سب کے تعین حامی ہونا ہی اس کی مقبولیت کی وجہ ہے۔

غزل اکبر جے پوری

کس کو معلوملے خاک میں منظر کتنے
اپنے آئینے چھپائے ہیں سکندر کتنے

اس شعر میں شاعر اکبر جے پوری نے دنیا کی بے ثباتی کی عکاسی کی ہے۔اور کہتے ہیں کہ نہ جانے کتنے دنیا کو زیبائش بخشنے والے منظر خاک میں مل گئے یعنی ویران اور تارج ہو گئے اور سکندر جیسے کتنے عظیم فاتح بادشاہ خاک میں پیوند ہو گئے یعنی خاک کی نذر ہو گئے۔مختصر یہ کہ دنیا کی آبادیاں زیر خاک مقیم ہو گئے۔

تشنہ لب تر سا کئے پیاس لئے آنکھوں میں
اور محلوں میں چھلکتے رہی شاعر کتنے

اس شعر میں اکبر جے پوری نے عصری تفاوت کی عکاسی کی ہے۔شاعر کہتے ہیں دنیا کا بسر اوقات یکساں نہیں۔کسی کی زندگی تسکین تو کسی کی اضطراب کی نذر ہو جاتی ہے۔کسی کی انکھوں سے اس کے ہونٹوں کی پیاس عیاں ہوتی ہے تو کسی کی محفل میں شراب کی ندیاں بہتی ہیں یعنی کچھ لوگ پانی کی ایک بوند ھ کو ترستے ہیں تو کچھ جام بھر بھر کے نوش فرماتے ہیں۔

پرچم امن لئے پھرتے ہیں شہروں شہروں
آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر کتنے

اس شعر میں شاعر اکبر جے پوری نے قوم کے س براہان مفاد پرست کی طرف اشارہ کیا ہے۔اور کہتے ہیں کہ چند سر براہان اپنے فائدے کے لئے امن و آستی کے علمبر دار بن کر شہروں شہروں گھومتے پھرتے ہیں۔دراصل یہ اپنے آستینوں میں خنجر چھپائے ہوئے ہوتے ہیں یعنی یہ ابدامنی کی آگ پھیلانے میں کوئی کثر نہیں چھوڑتے۔یہ دراصل اپنے مفادات کے لئے امن کا

پرچار کرتے ہیں۔ دراصل یہ قوم کے قاتل ہیں۔

کس طرح دیتا صدا مجھ کو پتہ یاد نہ تھا
یوں تو بستی میں نظر آئے کھلے در کتنے

شاعر اکبر کہتے ہیں کہ میں اپنی منزل مقصود کی تلاش میں بستی بستی پھرا ہوں یعنی اپنے محبوب کے مسکن کی تلاس میں در بدر اس کی بستی میں گھومتا ہوں مگر بے سود۔ بستی میں تو متعدد در کھلے نظر آئے مگر میں اس کو، کس طرح تلاش کرتا اور صدا دیتا کیونکہ مجھے اس کا پتہ معلوم کی نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ مجھے گرد سفر کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ بقولِ فاکر

تا عمر ڈھونڈتا رہا منزل میں عشق کی
انجام یہ کہ گرچِ سفر لے کے آگیا
دیکھ کر تشنہ لبی میری تعجب نہ کرو
میں نے صحراؤں کو بخشے ہیں سمندر کتنے

اس شعر میں اکبر جے پوری لوگوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ اے لوگوں! تم میری فاقہ کشی اور پیاس اور بدحالی پر حیران مت ہوجاؤ۔ ہم نے صحراؤں کو سمندروں سے نوازا ہے اور ویرانوں کو آباد کیا ہے۔ یعنی ہم نے پیاسوں کی پیاس بجھائی ہے اور ان کی تسکین کے لئے ہم نے خود کو لٹا دیا۔ گو بسبب ہم اس حالِ تباہ میں متبلہ ہوگئے۔

قصیدہ شہر آشوب

قصیدہ کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اقسام

قصیدہ نظم کی وہ صنف ہے جو کسی زندہ انسان کی تعریف یا برائی میں لکھی جائے۔ ایک شاعر کسی کے اچھے کاموں سے متاثر ہوکر اس کے اوصاف اور کارنوموں کو بیان کرنے لگتا ہے۔

عرب کا کوئی بھی شاعر اس وقت تک قصیدہ نہیں کہتا تھا۔ جب تک وہ ممدوح کو (جس کی تعریف یا برائی کی جائے) تعریف کے لائق نہ پاتا

قصیدہ کا معنی دلدار یا فخر کے ہیں، قصیدہ لکھتے وقت ایک شاعر کو انتہائی ذہنی قوت کا ستعمال کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے اس کا نام قصیدہ پڑ گیا کیونکہ قصیدہ کا اصلی معنی ارادہ کے ہیں۔ شاعر ارادہ کر کے کسی خاص موضوع پر اپنی پوری توجہ کے ساتھ شعر کہتا ہے۔ قصیدہ میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسے مطلع کہتے ہے۔ ایک قصیدہ میں ایک سے زیادہ مطلع ہوتے ہیں۔ یہ مطلع اشعار کے بیچ میں پائے جاتے ہیں۔

قصیدہ کے اقسام:

ہیت کے لحاظ سے قصیدہ کی دو قسمیں ہیں

الف) خطابیہ:

جب قصیدہ براہ راست کسی کی تعریف، مدح یا ہجو سے شروع ہوتا ہے۔

ب) تمہیدیہ:

جب قصیدہ براہ راست اصل موضوع سے شروع نہیں ہوتا یعنی کسی کی تعریف سے شروع نہ کیا جائے تو ایسے قصیدہ کو تمہیدیہ کہتے ہیں۔

قصیدہ کے اجزائے ترکیبی:

تمہیدیہ قصیدہ کے چار اجزاء ہوتے ہیں۔

(الف) تمہید یا تشبیب:

اسے نسیب بھی کہتے ہے۔ اصل موضوع یعنی مدح یا مذمّت شروع کرنے سے پہلے شاعر کچھ اشعار بطور تمہید کہتے ہیں۔ ان اشعار میں بہار، شراب و شباب، حسن و عشق، پند و نصحت وغیرہ مضامین پر لکھے جاتے ہے۔

ب) گریز:

یہ قصیدہ کا وہ حصّہ ہے جہاں شاعر تمہید کو ترک کر کے مدح کی طرف توجہ دیتا ہے۔ وہ اشعار جو تمہید کے غیر متعلق جُز کو مدح سے ملاتے ہیں گریز کہلاتے ہیں۔

ج) مدح یا مذمت:

یہی قصیدہ کا اصل موضوع ہے۔ مدّح میں عام طور پر ممدوح کے علم و عقل، انصاف، بہادری، شرافت، سخاوت وغیرہ کی تعریف بڑے حیرت کُن انداز میں کرتے ہیں۔ گھوڑے اور شمشیر کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

د) مقطع یا خاتمہ بر دعا:

یہ قصیدہ کا آخری جُز ہے۔ اس مین شاعر ممدوح کی سلامتی اور عمر درازی کی دعا کرتا ہے کیونکہ وہ ممدوح سے انعام کا طالب ہوتا ہے۔ اسی لئے قصیدہ کے اس آخری جُز کو حسنِ طلب کا نام بھی دیتے ہیں۔

اردو قصیدہ نگاری میں سوداؔ اور ذوقؔ بلند مرتبہ رکھنے والے قصیدہ گو مانے جاتے ہیں۔ انکے علاوہ انشاء، مصحفیؔ، راسخ عظیم آبادی، مومنؔ دہلوی، طالبؔ دہلوی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی وغیرہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

تشریحات قصیدہ شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جوان ہے دعویٰ کہ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے

سوداؔ اس شاعرانہ تعلیٰ میں کہتے ہیں کہ میرے سامنے کوئی بھی شاعر چاہے بوڑھا ہو یا جوان یہ دعویٰ نہ کرے کہ وہ شیرین ربان، سحر بیاں شاعر ہے یا موزوں کلام ترتیب دے سکتا ہے۔سودا کی شیرین زبانی، سوز و گدازی اور سخن وری کا کوئی مقابلہ نہیں

میں حضرت سودا کو بنا بولتے یارو اللہ اللہ بے! کیا نظم بیاں ہے

کوئی شخص سوداؔ

سوداؔ اہل سخن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میں نے سوداؔ کو نظم کہتے ہوئے سنا ہے۔اس کے انداز تحریر و تقریر کا کوئی ثانی نہیں۔قدرت الٰہی سے اس کی زبان کی روانی، شیرین بیانی اور تخیل و شوخی کا کوئی مقابلہ نہیں۔

اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت آڑام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے

وہ شخص سوداؔ سے کہنے لگا کہ دُنیا میں کوئی ایسا ٹھی ہے جس کی زندگی آرام سے گزری ہو اور جس نے زندگی میں خوشی ہی خوشی دیکھی ہو۔لیکن یہاں ایسا کوئی بھی نہیں ہے۔

سن کر لگے یہ کہنے کہ خاموش ہی ہوجا اس امر میں قاصر تو فرشتے کی زباں ہے

سوداؔ نے اس شخص سے کہا کہ اے نادان! اچھائی اسی میں ہے کہ آپ خاموش ہی رہے۔ اس سلسلے میں فرشتے بھی کچھ کہنے کے لئے بے بس ہے۔لہٰذا آپ کا خاموش رہنا ہی ٹھیک ہوگا۔

کیا کیا بتاؤں کہ زمانے میں کئی مشکل ہے وجہِ معاش اپنی، سو جس کا یہ بیاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ میں کیا بتاؤں کہ زمانہ کتنے رنگ اور روپ بدلتا رہتا ہے۔ زمانے میں روزی روٹی کمانے کے متعدد ذرایعہ موجود ہیں مگر تباہ حال ہو چکیں ہیں۔ موجودہ دور میں اکثر و بیشتر پیشے زوال کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان پیشوں کے متعلق میں تذکرہ کروں گا۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں روزی روٹی حاصل کرنا مشکل عمل بن گئی ہے۔ اگر کسی کا پیشہ سائیسی ہے اور وہ اپنا پیشہ منہی بخوبی انجام دیتا ہے تو اس کی تنخواہ اس کی پہنچ سے پرے آسمان پر ہے۔ یعنی اس کی خدمت کا معاوضہ یعنی تنخواہ نہیں ملتی ہے۔

گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر شمشیر جو گھر میں تو سپر بینے کے ہاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ سائیس رات دن محنت و مشقت کرتا رہتا ہے مگر بے سود۔ اتنی مشقت کے بعد وہ بدحالی کی زندگی گزارتا ہے۔ گھوڑے کیلئے گھاس اور اپنے لئے اناج حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کی تلوار گھر پر اور اس کی ڈھال بنئے کی دکان پر گروی رہتی ہے۔ تب جا کے وہ گھاس اور اناج حاصل کرتا ہے۔

سودا گری کیجئے تو ہے اس میں مشقت دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں موجودہ دور میں سودا گری اور تجارت میں بھی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ معیشت کی محنت آزار جان بنی ہے۔ سوداگروں کو مال صفہان (ایران کا ایک شہر) سے خریدنا پڑتا ہے اور ہندوستان کے شہر دکھن میں فروخت کرنا پڑتا ہے۔

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستنی الاحوال دیکھے جو کوئی فکر تردّد کو تو یاں ہے

سودا کہتے ہیں کہ شاعروں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ لاپرواہ ہوتے ہیں۔اگر ان کو کسی قسم کی فکر ہوتی ہے تو صرف دولت کی۔اگر ان کے پاس دولت ہو تو ان کی حالت ٹھیک ہے باقی ان کو کسی بھی قسم کی فکر لاحق نہیں ہوتی ہے۔

مشتاق ملاقات انہوں کا کس و ناکس ملنا انہیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے

سودا کہتے ہیں کہ اپنے اور غیر بھی شاعروں سے ملنے کا شوق رکھتے ہے۔لیکن شاعر ان ہی سے ملنے کا طالب یعنی خواہش مند ہے جو مشہور ہوں یعنی وہ بڑے بڑے اور نامور لوگوں سے ہی ملنا پسند کرتے ہیں۔

گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ نیت قطعہ تہنیت خانِ زماں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ اگر شاعر عید کے دن مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھیں تو وہاں پر ان کی نیت نماز پڑھنے کی نہیں ہوتی ہے بلکہ بڑے بڑے لوگوں کے نام قطعہ تہنیت یعنی مبارک بادی کے چند اشعار لکھنے کی ہوتی ہے۔تا کہ اس کے عوض ان کو کچھ معاوضہ حاصل ہو۔

ملّائی اگر کیجئے تو ملا کی ہے یہ قدر ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

شاعر سوداؔ کہتے ہیں کہ زمانہ اس قدر بدل گیا ہے کہ اب مولوی اور امام صاحبان کی کوئی قدر ہی نہیں رہی۔انہیں اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔اگر وہ کہیں دو اشعار مثنوی کے پڑھے تو اس کے حصہ میں دو روپے آجاتے ہیں ورنہ اس کی زمانے میں کوئی قدر ہی نہیں۔

اور ما حضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں یک کاسۂ دالِ عدس و جو کی دو نیاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ ایک استاد کے بارے میں کیا بتاؤں کہ اس کی حالت کیسی ہے۔اس کی خدمت کے عوض اسے ایک پیالہ مسور کی دال اور جو کی دو روٹیاں ملتی ہیں۔ایک استاد کی کوئی

قدر اور عزت نہیں کی جاتی۔

اتنا میں کیا عرض کہ فرمائے حضرت آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے

وہ شخص سودا سے کہنے لگا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی زندگی آرام سے گزری ہو اور جس نے زندگی میں خوشی دیکھی ہو۔لیکن یہاں ایسا کوئی بھی نہیں ہے۔

سن کر لگے یہ کہنے کہ خاموش ہوجا اس امر میں قاصر تو فرشتے کی زباں ہے

سوداؔ نے اس شخص سے کہا کہ اے نادان! اچھائی اسی میں ہے کہ آپ خاموش ہی رہے۔ اس سلسلے میں فرشتے بھی کچھ کہنے کے لئے بے بس ہے۔لہٰذا آپ کا خاموش رہنا ہی ٹھیک ہوگا۔

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل ہے وجہِ معاش اپنی، سو جس کا یہ بیاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ میں کیا بتاؤں کہ زمانہ کتنے رنگ اور روپ بدلتا رہتا ہے۔زمانے میں روزی روٹی کمانے کے متعدد ذرایعہ موجود ہیں مگر تباہ حال ہوچکیں ہیں۔موجودہ دور میں اکثر بیشتر پیشے زوال کا شکار ہوگئے ہیں۔ان پیشوں کے متعلق میں تذکرہ کروں گا۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں روزی روٹی حاصل کرنا مشکل عمل بن گئی ہے۔اگر کسی کا پیشہ سائیسی ہے اور وہ اپنا پیشہ منسی بخوبی انجام دیتا ہے تو اس کی تنخواہ اس کی پہنچ سے پرے آسمان پر ہے۔یعنی اس کی خدمت کا معاوضہ یعنی تنخواہ نہیں ملتی ہے۔

گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر شمشیر کا پھر عالم بالا پہ مکاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ سائیس رات دن محنت و مشقت کرتا رہتا ہے مگر بے سود۔اتنی مشقت کے بعد کے وہ بدحالی کی زندگی گزارتا ہے۔گھوڑے کیلئے گھاس اور اپنے لئے اناج حاصل کرنا

دشوار ہو جاتا ہے۔اس کی تلوار گھر پر اور اس کی ڈھال بنئے کی دکان پر گروی رہتی ہے۔تب جا کے وہ گھاس اور اناج حاصل کرتا ہے۔

بے تال ہو شیخ جو ٹک وجد میں آ کر　　　سرگوشیوں میں پھر ابد اصولی کا بیاں ہے

سوؔدا کہتے ہیں کہ وجد میں آ کر یعنی ذوق وشوق کی حالت میں پیر و مریداں بے تال یعنی بے قابو ہو جاتے ہیں۔ان کی آواز نہ ساز سے ملتی ہے اور نہ ہی ساز کی آواز ان سے ملتی ہے۔وہ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں اور بد اصولی کا بیاں کرنا شروع کرتے ہیں یعنی لوگوں کو ٹھگنے کی کوشش میں لگجاتے ہیں جبکہ کیفیت وجد صرف دکھاوا ہے۔

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال　　　جمعیت خاطر کوئی صور ہو، کہاں ہے

سوؔدا اس شخص سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ کیا تم نے اس شہر آشوب کا کچھ حال سنا؟ کہ یہاں ایسا کوئی ہے جس نے اپنی زندگی آرام سے گذاری ہو۔دراصل ایسا کوئی بھی نہیں ہے۔یہاں کسی کو بھی آرام حاصل نہیں اور سب پریشان نظر آتے ہیں۔

دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام　　　عقبیٰ میں یہ رکھتا تھا کوئی، اس کا نشاں ہے

سوؔدا کہتے ہیں کہ دنیا میں خوشحالی صرف نام کے واسطے ہے۔یہاں یعنی اس دنیا میں خوشحالی دراصل نہیں ہے۔کہا جاتا ہے کہ خو مرنے کے بعد آخرت میں نصیب ہو گی۔اگر یہاں نہیں ملے گی تو ضرور دوسری دنیا میں ملے گی۔

سو اس پہ یقین کسی کے دل کو نہیں ہے　　　یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے

سوؔدا کہتے ہیں کہ خوشحالی پر اب کسی کو بھی بھروسہ نہیں ہے۔اصل میں یہ کہنے والے کا وہم

وگمان ہے۔خوشحالی نہ تو یہاں ملتی ہے اور نہ ہی آخرت میں ۔اس بات پر یقین کرنا غلط ہے کہ خوشحالی یہاں نہیں تو وہاں اخرت میں ملے گی۔

یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر　　آسودگی حرفیست ،نہ وہ یاں ہے نہ واں ہے

سوؔدا کہتے ہیں کہ اس دنیا میں آدمی کو اپنی روزی روٹی کی فکر پریشان کرتی ہے اور آخرت میں حساب وکتاب کا ڈر۔لہٰذا خوشحالی نہ اس دنیا میں ہے اور نہ ہی آخرت میں ہے۔

دن کو وہ بے چارہ پڑھایا کرے لڑکے　　شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

سوؔدا کہتے ہیں کہ ایک استاد بے چارہ دن بھر مدرسہ میں طالب علموں کو پڑھاتا رہتا ہے اور اگر استاد ہندسہ داں ہے یعنی حساب جاننے والا ہے تو اس کی رات گھر کے خرچے کا حساب و کتاب کرتے کرتے گذر جاتی ہے۔

اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات　　آرام جو چاہے وہ کرے،وقت کہاں ہے

سوؔدا کہتے ہیں کہ اب آپ ہی انصاف کیجئے جس آدمی کی یہ حالت ہو کہ دن بھر طالب علموں کو پڑھائے اور رات بھر گھر کا حساب وکتاب لکھتے تو اس کو آرام کہاں نصیب ہوگا۔

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت　　چھٹتے ہی تو شعرا کا وہ مطعونِ زباں ہے

سوؔدا کہتے ہیں اگر کوئی شیخ بننا چاہتا ہے تو شوق سے بنے۔شیخ بننے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔لیکن شیخ بن کر وہ شعراء کے طعنوں سے بچ نہیں سکتا۔شعراء حضرات ان پر طعنے دینے شروع کریں گے۔

تحقیقی ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگی　　لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ شیخ صاحب یا پیر صاحب کا یہ حال ہے کہ وہ اکثر اپنے مریدوں سے عرس کی تحقیق کرتا رہتا ہے اور جب اس کو کسی صاحب مزار کے عرس کی خبر ملتی ہے تو وہ زیبائش و آرائش کر کے اور اپنی داڑھی سنوار کے اپنے مریدوں کی جماعت لے کر صاحب مزار کے آستان پر جاتے ہیں اور اس عرس کے مزے لوٹتے ہیں۔

ڈھولک جو لگی بجنے، تو واں سب کو ہوا وجد کوئی کودے کوئی رودے، کوئی نعرہ زناں ہے

سوداؔ کہتے ہیں کہ آستان میں عرس کے موقعہ پر جب قوّال ڈھولک بجاتا ہے تو اس کی آواز سنتے ہی پیرو مریداں کو وجد طاری ہوتا ہے۔ یعنی ان پر مستی چھا جاتی ہے۔ اس ذوق وشوق اور مستی کی حالت میں کوئی ناچنے لگتا ہے تو کوئی رقص کرتا ہے۔ کوئی رونے لگتا ہے تو کوئی نعرے بلند کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ڈھولک کا جادو اہل بزم کے وجد کی وجہ بن جاتی ہے۔

قصیدہ شہر آشوب کے کتابی سوالات کے جوابات

جواب ۱:

سوداؔ نے قصیدہ شہر آشوب میں جن پیشوں کا ذکر کیا ہیں ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

ا) سوداگری ب) شاعری ج) ملّائی د) مدرسی ز) سائیسی ہ) پیری و درویشی وغیرہ

جواب ۲:

قصیدہ میں درج شدہ وہ الفاظ جو اب استعمال نہیں ہوتے یا جن کے معنی بدل گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

الف) میں نے کیا عرض بمعنی میں نے عرض کیا

ب) انہوں کا بمعنی ان کا

ج) کسو کی بمعنی کس کی

د) میں سوداؔ کو بمعنی میں نے سوداؔ کو

ط) واں بمعنی وہاں

ظ) یاں بمعنی یہاں

ف) چھٹے ہی بمعنی چھوٹتے ہی

ق) اخوند بمعنی استاد

ہ) سو بمعنی وغیرہ

جواب (۴) اور جواب (۵) شہر آشوب سے مراد فتنہ وفساد کا شہر یا شور وغوغا کا شہر ہے۔

شہر آشوب ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی تباہی اور بدحالی یا زمانے کی عام ابتری اور بدنظمی کا ذکر ہو۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد دلی شہر پر انگریزوں نے اپنا غصّہ خاص طور سے اتارا اور اسے خوب تباہ و برباد کیا۔ اس تباہی پر رنج وغم کا اظہار کرنے کے لئے جو نظمیں لکھی گئی ان کو شہر آشوب کہا گیا ہے۔ چونکہ سوداؔ کا یہ قصیدہ بھی دلی شہر کی تباہی کا حال بیان کرتا ہے اس لئے سوداؔ نے اس قصیدے کو شہر آشوب قرار دیا ہے۔

مرثیہ نگاری

مرثیہ 'رثا' سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی مرحوم کی تعریف کے ہیں۔ اصطلاح شعر میں اس صنف کو کہتے یں جس میں کسی مرنے والے کی تعریف وتوصیف اور اس کی وفات پر اظہار ماتم کیا جائے۔ ابتداء میں مرثئے بہت مختصر ہوا کرتے تھے۔ تین سے چھ مصرعوں والے بند بھی نظم کی حالت میں استعمال ہوئے ہیں۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کا تذکرہ ذیل درج ہیں۔

الف) چہرہ:

چہرہ مرثیہ کی تمہید کو کہتے ہیں۔ اس میں شاعر مختلف مضامین نظم کرتا ہے۔ جن کا مرثیہ کے اصل موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا جیسے صبح کا منظر، رات کا سماں، گرمی کی شدت دنیا کی بیثباتی، سفر کے مصائب، حمد ونعت وغیرہ۔

ب) سراپا:

اس میں مرثیہ کے ہیرو کے قد وقامت، خدوخال اور دیگر اوصاف کو بیان کیا جاتا ہے۔

ج) رخصت:

اس حصّے میں ہیرو کو میدان جنگ میں جانے کیلئے حضرت حسینؓ سے اجازت لیتے ہوئے اور تمام عزیزوں سے رخصت ہوتے دکھایا جاتا ہے۔

د) آمد:

اس میں ہیرو گھوڑے پر سوار ہوکر شان وشوکت کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتا ہے۔ گھوڑے کی بہادری، وفاداری مبالغہ آمیز اسلوب سے بیان کی جاتی ہے۔

س) رجز:

ہیرو اپنے خاندان کی تعریف اپنے بزرگوں کے کارنامے بیان کرتا ہے۔اور جنگ کے معاملات میں اپنی مہارت اور بہادری کا بیان کرتا ہے۔ دشمن کے جس پہلوان سے مقابلہ کرتا ہے وہ بھی اپنی بہادری اور خاندانی کارنامے مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتا ہے۔

جنگ:

ہیرو مقابل کے کسی نامور پہلوان یا پوری فوج سے بڑی شجاعت اور بہادری کے ساتھ لڑتا ہے۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کی تلوار اور گھوڑے کی تعریف کی جاتی ہے۔

شہادت:

ہیرو میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے آخر دشمن کے ہاتھوں زخمی ہو کر شہید ہو جاتا ہے۔مرثیے کے اس جُز میں اسی شجاعت کا بیان انتہائی موثر انداز میں کیا جاتا ہے۔

تین:

اس آخری حصّے میں اس منظر کی تصویر کشی کی جاتی ہے جب ہیرو کی لاش پر اُس کے رشتہ دار خاص کر رشتے کی عورتیں اس کی خوبیاں بیان کرتی ہیں۔

حضرت علی اصغر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کیلئے پانی مانگنا از مرزا سلامت علی دبیرؔ

ہر ایک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفیٰ لے تو چلا ہوں، فوج عمر سے کہوں گا کیا
نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں کے وہ بلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عسو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

مرثیہ کے اس بند میں مرزا سلامت علی دبیرؔ کہتے ہیں حضرت حسینؓ قدم قدم پر سوچتے تھے کہ اصغر علی کو عمر کی فوج کے قریب لیجلا ہوں لیکن میں ان کو پانی کیلئے گذارش کیسے کروں مجھے تو نہ التجا کرنی آتی ہے اور نہ ہی مانگنا آتا ہے۔ اگر میں ان سنگ دل اور بدبختوں سے گذارش بھی کروں گا تو ان کے دل پر کوئی بھی اثر نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ یہ سننے کیلئے تیار ہیں۔ یہ سنگ دل کم ظرف رحم نہیں کھائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ وہ پانی نہیں پلائیں گے۔ آج علی اصغرؓ کی جان اور میری آبرو یقیناً جائے گی۔

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے چاہا کریں سوال پر شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

جب حضرت حسینؓ دشمن کی فوج کے قریب اپنے ہاتھوں میں اپنے بچے علی اصغرؓ کو لائے تو وہ گھبرا کے رہ گئے۔ انہوں نے چاہا کہ ان سے پانی کے بارے میں سوال کریں گے۔ لیکن جھجک محسوس ہوئی اور شرما گئے۔ غیرت کی وجہ سے ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور

تھرّ اہٹ محسوس ہوئی۔ اپنے بیٹے کے چہرے سے چادر سرکائی اور آنکھیں نیچی کر کے فرمایا کہ میں یہاں نہیں آتا مگر مجھے اس بچے نے آپ کے پاس لایا ہے۔ اور اصغر تمہارے پاس عرضی لے کے آیا ہے۔

گر میں یہ قول شمر عمر ہوں گناہ گار یہ تو نہیں کسی کے آگے قصور وار
شِش ماہہ بے زبان نبیؐ زادہ شیر خوار ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار
سِن ہے جو کم تو پیاسی کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہیں اور یہ مظلوم زادہ ہے

حضرت حسینؓ دشمن کے فوجوں کو سمجھا رہے ہیں کہ اگر میں شمر اور عمر کے قول کے مطابق گناہ گار ہوں لیکن یہ معصوم بچہ بے قصور ہے۔ اس پر رحم کرو۔ چھ مہینے کا بچہ، نبی کا نواسہ دودھ پیتا بچہ، سات دنوں سے پانی کے لئے ترس رہا ہے۔ بے قرار اور بے چین ہے۔ عمر چھوٹی ہے۔ لیکن پیاس کی شدت زیادہ ہے۔ میں تو خود بھی مظلوم ہوں اور یہ مظلوم زادہ ہے۔

یہ کون بے زباں ہے تمہیں کچھ خیال ہے دُرِّ نجف ہے بانوے بے کس کا لال ہے
مان لو، تمہیں قسمِ ذوالجلال ہے یثرب کے شاہ زادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علیؓ کا تم سے طلب گارِ آب ہے
دے دو کہ اس میں نام وری ہے ثواب ہے

آگے چل حضرت حسینؓ دشمن کی فوج کے سامنے فرماتے ہیں کیا تم جانتے ہو کہ یہ بے زبان معصوم بچہ کون ہے؟ یہ حضرت علیؓ کا نواسہ ہے اور بانوے بے کس کا بیٹا ہے۔ حضرت علیؓ کا پوتا اب تم سے پانی کی مانگ کر رہا ہے۔ خدا کے لئے اس کو پانی پلاؤ اس میں تمہاری ناموری ہے اور یہ نیک کام بھی ہے۔

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر　　رو کر کہا جو کہنا تھا سو کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر　　سوکھی زبان تم بھی دکھادو نکال کر

پھیری زبان کیوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؓ نے

حضرت حسینؓ نے اپنی تقریر کے بعد علی اصغر کے ہونٹ چوم لئے اور سر جھکا کے روتے ہوئے فرمایا اے میرے بیٹے جو کچھ باپ کو کہنا تھا سو کہہ چکا ہوں اب میں نے کوئی بات باقی نہ رکھی۔ اپنی سوکھی ہوئی زبان باہر نکار کر ان کو دکھادو۔ اس کے بعد علی اصغر نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر دی اور حضرت حسینؓ تھراتے ہوئے خدا کی جانب بے کسی کی حالت میں رجوع کر رہے ہیں۔

کتابی سوالات کے جوابات

جواب:

حضرت امام حسینؓ نے یزیدی افواج سے یہ سوال کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ یہ بے زبان بچہ کون ہے؟ یہ حضرت علیؓ کا نواسہ ہے اور بے بس بانوؓ کا بیٹا ہے۔ حضرت علیؓ کا پوتا اب تم سے پانی مانگ رہا ہے۔ خدا کے لئے اس کو پانی پلاؤ اس میں تمہاری ناموری ہے اور یہ نیک کام بھی ہے۔

نعت از رسا جاودانی

بنی نوعِ انسان کا غم خوار آیا　　وہ تخلیق عالم کا شکار کار آیا
وہ نبیوں کا سرتاج سردار آیا　　خوش اندام آیا خوش اطوار آیا
تو آیا تیرے آنے کی آرزو تھی　　نگاہوں کو بس تیری ہی جستجو تھی

نظم نعت کے اس بند میں شاعر رسا جاودانی نعمت آمد مصطفیٰ ﷺ کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آدمؑ کے سلسلۂ نسب سے ایسے انسان کام کا نمود ہوا جو تمام انسانوں کی غم دفائی کے لئے موثر ثابت ہوئے۔

تمام مخلوقات خالق یعنی خدا تعالیٰ کے تمام تخلیق شدہ جاندار و بے جان عالم میں بہترین نمونہ ثابت ہوئے۔ حضور پیغمبر آخر الزماں سرور عالم حضرت محمد ﷺ کو خالق نے بادشاہ و سردارِ انبیاء کے سہرہ سے بھی نوازا۔

آپ ﷺ کے بدن اطہر کا قرینہ قرینہ پُر نور و خوبصورت تھا۔ آپ ﷺ کی فطرت اور طور طریقے باعثِ کشش ثابت ہوئے۔ جب حضور بصورت نبی عیاں ہوئے تو آپؐ کے اطوار دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے صدیوں سے مخلوق کو آپؐ کی آمد کی آرزو تھی اور ان کی نگاہوں کی چمک سے یہ ظاہر ہوا کہ جیسے یہ نگاہیں صدیوں سے آپ کے دیدار کی منتظر تھیں۔

تو اے ابر رحمت جو دنیا میں آیا　　شرف آدم و آدمیت نے پایا
تو وہ سروقامت نہیں جس کا سایا　　مگر بن کے رحمت تو عالم پہ چھایا
قدم تیرا جب سے پڑا ہے زمین پر　　زمین فوق رکھتی ہے عرش بریں پر

آپ کی رحمت اس دنیا میں اس طرح سایہ ڈالتی ہے جس طرح کسی مخصوص جگہ پر ابر کا ٹکڑا سایہ ڈالتا ہے۔ آپؐ کی آمد سے انسان کیا بلکہ انسانیت کو وہ مقام وہ عزت واپس حاصل

ہوئی جس سے وہ مدتوں محروم تھا۔

خالق نے آپؐ کو اس معجزے سے نوازا تھا کہ آپؐ کے بدنِ اطہر سرو قامت بے سایہ تھا یعنی آپؐ کے بدن مبارک کا سایہ نہیں بنتا تھا۔ اس کے باوجود بھی پورے عالم پر آپؐ نے اپنی رحمت کا سایہ ڈال دیا۔

آپؐ کی اس دنیا میں موجودگی کی وجہ سے یعنی دنیا کی زمین پر آپؐ کے پائے ناز پڑنے کی وجہ سے یہ زمین آسمانوں سے درجے میں بالاتر ہوگئی۔

پیام آشتی کا ہے قرآن تیرا ہوا جاں گزیں دل میں فرمان تیرا
کرم ہر کسی پر ہے یکسان تیرا ہے دھرتی کے کندھوں پر احسان تیرا
جو سفقت مسلمان کے حال پر ہے وہی غیر مسلم پہ تیری نظر ہے

رسا جاودانی اس بند میں کہتے ہیں کہ حضورﷺ پر نازل شدہ کتاب یعنی قرآن امن کا درس دیتی ہے۔ انسانیت کی صحیح ترجمانی کے فرمان کا لباس قرآن کا لفظ نقط پہن چکا ہے۔ فرمانِ قرآن کی صداقت کی وجہ سے اس پاک کتاب نے ہمارے دلوں میں جگہ پالی۔ حضورﷺ نے فرمانِ خدا تعالیٰ کی عمل کر کے اور تلقین کر کے ہر ایک فرد کے ساتھ ایک جیسا سلوک گیا۔ اپنے اوصاف کامل کی وجہ سے اس زمین اور تمام مخلوقات خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم آپﷺ کے احسان چکا ہی نہیں سکتے۔ آپﷺ نے جو عزت مسلمانوں کو دی وہ ہی نظر غیر مسلموں پر بھی کی۔

یہ کردار تیرا نہ کیوں دل کا بھائے تو دل سے کیوں نہ من میں سمائے
تیری راہ میں جس نے کانٹے بچھائے رہے تیری شفقت کے اس پر بھی سائے
کدورت سے ہستی رہی پاک تیری بچی آنکھ میں سانِ لولاک تیری

رسا کہتے ہیں کہ حضورﷺ کے کردار واوصاف کی محض جنبش ہی دل کو پسند آتی تھی۔ مکمل عمل کی تو بات ہی نہیں۔ ایسے صفات کامل والا شخص ہمارے دلوں میں جگہ نہ پائے تو اور کون پائیں۔ ہمارے دلوں کو نہ لبھائیں تو کون لبھائیں۔ آپؐ کی زندگی میں یا منصوبوں میں جس کسی عدو نے بھی رکاوٹیں پیدا کر دیں آپؐ نے اس کو بھی محبت وشفقت کے سایے سے محروم ہونے نہ دیا۔ آپؐ کی ذات عطہر، اطوار اطہر اور طبیعت کا نور ہماری آنکھوں میں بس گیا اور دلوں میں بھی بس گیا۔

رام چندر جی اپنی ماں سے رخصت لیتے ہوئے

بند(الف):

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ　　بور نظر پہ دیدۂ حست سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ　　لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرہ کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا　　ہر موے تن زباں کی طرح بولنے لگا

اس بند میں شاعر چکبستؔ رام چندر جی کی ماں کے دردِ رخصت کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رام چندر جی کی ماں ان کی رخصتی کے وقت خیالوں میں گم تھیں۔ اسی بے خبری میں اپنے لخت جگر بیٹے کے چہرے کی طرف چشمۂ حیرت سے نظر ڈالی۔ رخصتی کے درد کی وجہ سے وہ بت بنے بیٹھی تھی۔ درد کی شدت ہونٹوں کی تھرتھراہٹ میں بدل کر بصورتِ آہ کی ظاہر ہوئی۔ یا رائے ضبط نہ ہوا کہ ان کی آنکھوں سے پیہم آنسوں نکل پڑے۔ اور رخساروں کی راہ لیتے ہوئے دامن پہ گر گئے۔ ان کے دل کا درد چہرے کے رنگ سے ظاہر تھا۔ بدن مادر کا ہر ایک جز زبان کی طرح آہ وفغاں کرنے لگا۔

بند(ب):

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا　　واتھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا
اک دفتر مظالم خرچ کہن کھلا　　افسانۂ شداید رنج و سخن کھلا
درد دل غریب جو صرف بیاں ہوا　　کون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

اس بند میں چکبستؔ کہتے ہیں کہ آخر کار رام چندر کی ماں نے قیدِ صبر کا تالا کھول دیا۔ اس کے لبوں سے شدت سے بھرے ہوئے آہ وفغاں کے کلمات ظاہر ہو گئے۔ جیسے دنیائے غم کا دروازہ کھل گیا اور اس نے مظلومیت کے احساس کی وجہ سے غموں کا دفتر کھول دیا اور اپنے

تکالیف کا افسانہ افراد موجود کو سنانے بیٹھ گئی۔ اس درد بھرے افسانے سے اس کے جگر کے خون کا درد ظاہر ہوا۔

بند (ج):

سن کر زبان سے مان کی یہ فریاد درد خیز　　اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　لیکن ہزار ضبط سے روزے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے　　نا شاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

اس بند میں چکبستؔ رام چندر جی کے ضبط کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی ماں کی زبان سے درد بھری فریاد سن کر رام چندر جی کے درد بھرے دل پر غم کی تلوار جیسی چلی۔ درد کی شدت کی وجہ سے آنکھوں سے آنسوں گرنے والے تھے کہ اچانک اپنی ماں کا خیال آیا کہ یہ بے چاری میرے آنسوؤں کی وجہ سے جان سے جائے گی۔ اسلئے صبر کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو روک لیا۔

بند (د):

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال　　ان بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ وسال　　خود سے درد ہجر کا کٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ ماتم ہوا کیا　　آخر کو روکے بیٹھ گئے اور کیا کیا

اس بند میں چکبستؔ کہتے ہیں کہ ماتم کا منظر دیکھ کر یعنی ماں اور بیٹے کا ملال دیکھ کر افرادِ موجود نے یہ خیال بٹھایا کہ ان دونوں کا بچنا آج مشکل ہے مگر واہ رے خالق کی شان! کہ دن اور مہینے گزرتے ہی بڑے سے بڑے درد کی دوا ہو جاتی ہے۔ یعنی وقت سب سے بڑا مرحم ہے۔ مہینے سال گزرتے ہی جدائی کے غم کا خیال دل سے رفع ہوتا ہے۔ اگرچہ شروعاتی دنوں میں فریاد

وماتم ہوامگرآخرکاررو تے روتے سب نے صبر کرنا سیکھ لیا۔

بند(و):

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں ہے دن کو دھوپ کو شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں وہ گل ہزاروں پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے تھے جو عزیز انہیں جان کی طرح ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

جس طرح گلچیں باغ کو سجانے کے لئے محنت ومشقت کرتا ہے۔اسے ہر ایک مضر موددوں سے حفاظت مہیا کرتا ہے۔مگر افسوس کہ اس چمن پر جب خزاں کی آمد ہوتی ہے تو چمن تاراج ہوجاتا ہے۔اور پھول بے رنگ ہوجاتے ہیں۔اگرچہ اس چمن کو ہزاروں حفاظتی پردوں میں رکھا بھی ہوگا۔اگرچہ گلچیں ان پھولوں اور پتوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔خزاں کی وجہ سے چمن لٹتے ہوئے دیکھ کر مایوسی کے ہاتھ ملنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

بند(ہ):

اپنی نگاہ ہے کرم کارِ ساز پر صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ حضر رہتا نہیں وہ حال سے بندوں کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

نظم کے آخری بند میں چکبستؔ خالق کی رحمت کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مظلوم اور درد کے ماروں کی نظر اور بھروسہ ہمیشہ اسی بگڑی بنانے والے خالق پر ہوتا ہے۔اس کی مہربانی اگر ساتھ ہوتو صحراؤں میں بھی چمن کا احساس ہوتا ہے۔درد بھی سکون کا مزہ دیتا ہے۔وہ اپنے بندوں پر ہمیشہ کریم ہوتا ہے۔اوران کے حال سے لمحہ بھر بھی بے خبر نہیں ہوتا۔خالق کا کرم جس پر ہوا ُ سے درد کا کیا درد ہوگا۔اس کیلئے ریگستان کا درد بھرا دامن بھی ماں کے سکون والا دامن ثابت ہوگا۔